محمد خاور نوازش
لیکچرر، شعبہ اُردو
گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج خانیوال

اقبالؔ: 'اسرارِ خودی' سے 'تاریخِ تصوف' تک (سعیِ بازیافت)

It is taken for granted (ironically, it is true in many cases) for a researcher to be a fan of Iqbal if he/she is interested in doing some research on the former's works and systems of thought. This over-simplified attitude on behalf of the researcher indicates effectively the repetition of same ideas in the tradition of criticism of Iqbal. There is no doubt about Iqbal's craftsmanship as a poet. But, it is not necessarily the job of a researcher to make him a god-like figure in other aspects of human experiences. Studying him in theory and practice is significantly important for a better understanding of his works. The following article discusses Asrar-e-Khudi, his first important work along with his Tareekh-e-Tasawuf. The article raises some questions which have not been raised in this way before as if asking such questions would implicate anti-Iqbal sentiment. The article would help the general audience to discover some novel aspects of Iqbal's persona and works.

اختلاف اور انکار دو ایسے الفاظ ہیں جو الگ الگ معانی کے متحمل ہونے کے باوجود اقبالیات کے ضمن میں ہمیشہ ایک ایسے معانی کے حامل قرار پاتے رہے ہیں گویا دوسرے لفظوں میں فکرِ اقبال کے کسی پہلو سے اختلاف کو اُس سے انکار کے مترادف سمجھا گیا۔ یہ ایک رائے نہیں بلکہ اقبال شناسی کی قریب ایک صدی پر محیط اُس روایت کا ایک پہلو ہے جس میں ماسوائے چند اہلِ علم' اقبال شناس ہونے سے مراد اقبالؔ کا مداح ہونا معلوم ہوتا ہے خواہ وہ اقبالؔ کے تصورات سے متفق ہونے کی صورت میں ہو یا اُن کے القابات کی کارگہِ شیشہ گراں سے بھی نازک مخصوص اقبالی دنیا تخلیق کرنے کی صورت میں جہاں اقبالؔ کے ذہنی مسائل اُن کے تصورات سمجھ لیے جاتے ہیں اور پھر ان تصورات سے اختلاف کو ہمارا ذہنی مسئلہ سمجھا جاتا ہے کہ اقبالیات آج بھی اختلاف کی تعبیر انکار کی معنوی دنیا کے تناظر میں کرنا اپنی بقا کے لیے ضروری سمجھتی ہے۔ دراصل 'اقبالی دنیا' کا ہر باشندہ اقبالؔ کے اندر شاعر، فلسفی، متکلم اور سیاستدان کی تلاش میں اس قدر سرگرداں رہا ہے کہ اُن کے اندر موجود انسانو ں ایسے زندہ انسان کی بازیافت مفقود ہوگئی اور آج بھی اُن کی شعری کائنات کی تشکیل و بازتشکیل کرنے والوں کی تمام تر اظہاری قوتیں چند سوالات کے سامنے یوں سربسجود دکھائی دیتی ہیں کہ جیسے یہ سوالات اُن کے مفروضات پر ضرب کاری کی کوشش کرتے ہوں۔ ان سوالات میں سے کچھ تو ایسے ہیں

جن کے جوابات اقبالؔ کی عملی زندگی کے مختلف ادوار میں ہی سامنے آ گئے لیکن کچھ سوالات بہرصورت آج بھی زندہ ہیں کہ اُن کا جواب دینا گویا اقبال دشمنی ہے اور اُردو دنیا اس جرم کے مرتکب ہونے والوں کے لیے یہ سزا ناکافی سمجھتی ہے کہ انھیں وطنِ عزیز کی جامعات میں قائم اقبال چیئرز کے لیے نااہل قرار دے دیا جائے۔ یہاں اقبالؔ کی شخصیت اور فکر کے حوالے سے چند ایسے سوالات سے بحث کرنے کی کوشش کی جائے گی جنھیں سوچ کر ہی شاید اقبالؔ نے کہا تھا:

برا سمجھوں انہیں ، مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبالؔ اپنے نکتہ چینوں میں

(''کلیاتِ اقبال''،ص۷۹)

۱۹۱۵ء میں اقبالؔ کا پہلا مجموعۂ کلام ''اسرارِ خودی'' شائع ہوا جو فارسی زبان میں تھا۔ اس سے پہلے اقبالؔ اُردو زبان میں کم و بیش اتنے اشعار ضرور کہہ چکے تھے کہ ایسا ایک مجموعہ شائع کر سکتے لیکن اب اُن کی ذہنی سطح پہلے سے بہت بلند ہو چکی تھی ۔ یورپ سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد وطن واپس پہنچے تو انجمن حمایت اِسلام کے جلسوں میں نظمیں پڑھنے والے اقبالؔ رہے تھے نہ ہی طوائف کے بالا خانہ پر رقص و سرور کی کسی محفل میں بلا جھجک جا بیٹھنے والے' اول الذکر سلسلہ تو کسی مصلحت اور پرانے واسطے کے پیشِ نظر چلتا رہا لیکن موخر الذکر سلسلہ جس میں سفر یورپ سے پہلے اُنھیں ہندوستانی تہذیب ایک جھلک دکھائی دیتی تھی اب شایانِ شان نہ لگا۔ بہر کیف ابتدائی دور کی تمام اُردو شاعری اب انھیں اپنے مذاقِ سخن سے بہت کم تر نظر آنے لگی تھی چنانچہ فارسی سے ایسا التفات پیدا ہوا جس میں ''اسرارِ خودی'' ایسی مثنوی لکھی ڈالی۔ ابتدا میں یہ مثنوی انھوں نے اُردو زبان میں ہی لکھنا شروع کی تھی لیکن جلد ہی اپنی اس فکری واردات کے متوقع ردِ عمل کا اندازہ ہونے لگا سو یہ مناسب جانا کہ ذریعۂ اظہار فارسی کو بنایا جائے کہ اس سے اول تو اُن کے خیالات اُس محدود طبقے تک پہنچیں جو فارسی زبان جاننے کے ساتھ ساتھ فارسی ادب اور بالخصوص حافظؔ کی فکر کے بارے میں جانکاری رکھتا ہو اور دوم ہندوستان سے باہر فارسی ادب کی روایت میں بھی اپنی پہچان بنا سکیں۔ اقبالؔ نے اس بات کی وضاحت میں یہ بیان دیا ہے:

''بعض اصحاب خیال کرتے ہیں کہ فارسی زبان میں نے اس لیے اختیار کی کہ میرے خیالات وسیع حلقے میں پہنچ جائیں۔ حالانکہ میرا مقصد اس کے بالکل برعکس تھا ۔ میں نے اپنی مثنوی اسرارِ خودی ابتدا میں صرف ہندوستان کے لیے لکھی تھی اور ہندوستان میں فارسی سمجھنے والے بہت کم تھے۔ میری غرض یہ تھی کہ جو خیالات میں باہر پہنچانا چاہتا ہوں وہ کم از کم حلقے تک پہنچیں۔''[۱]

''اسرارِ خودی'' کے حوالے سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبالؔ آخر یہ کیوں چاہتے تھے کہ اُن کے خیالات کم از کم حلقے تک پہنچیں۔ ایک ایسا شاعر جو انجمن حمایت اسلام کے عوامی جلسوں میں اپنی نظمیں ترنم کے ساتھ پڑھا کرتا تھا اپنی پہلی قابلِ ذکر کاوش اور اس قدر شبانہ روز محنت سے لکھی جانے والی مثنوی کے حوالے سے آخر کس خوف میں مبتلا تھا جو اشاعت سے پہلے ہی اسے مخصوص حلقے تک محدود رکھنے کا خواہاں ہے؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں ممکن ہے مولانا گرامی کے نام اقبالؔ کا خط محررہ ۱۸؍ جنوری ۱۹۱۵ء معاون ثابت ہو، جس میں وہ لکھتے ہیں:

'' اُردو اشعار لکھنے سے دل برداشتہ ہوتا جاتا ہوں ۔ فارسی کی طرف زیادہ میلان ہوتا جاتا ہے اور وجہ یہ ہے کہ دل کا بخار اُردو میں نکال نہیں سکتا۔''[۲]

یہ الفاظ ہیں اُردو زبان کے عظیم شاعر اقبالؔ کے جو اپنے دل کا بخار اُردو زبان میں نکالنے سے قاصر نہیں بلکہ حقیقت میں اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ ہندوستان میں اُردو سمجھنے والا ایک عام قاری اُن کے خیالات سے آگہی کے بعد اپنے دل کا بخار نکالنے میں پیچھے نہیں رہے گا۔دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اقبالؔ نے ''اسرارِ خودی'' کی اولین اشاعت میں اسے سر سید علی امام (۱۸۶۹ء۔۱۹۳۲ء)[۳] کے نام معنون کیا تھا لیکن اشاعت دوم (۱۹۱۸ء) میں یہ انتساب حذف کر دیا گیا۔ اس انتساب کو حذف کرنے کے ضمن میں جاوید اقبال واضح کرتے ہیں کہ یہ اعتراض کیا گیا تھا ہے کہ جس کتاب میں فلسفہ خودی کی تشریح کی گئی ہو اور قوم کی خود داری کی تعلیم دی گئی ہو اسے ایک خطاب یافتہ اور دنیا دار کے نام معنون کیوں کیا گیا[۴] گویا اقبالؔ نے اس ایک اعتراض پر اگلی اشاعت میں انتساب نکال دیا۔سوال یہ ہے کہ خطاب یافتہ ہونا اس قدر غلط امر تھا تو اقبالؔ نے یہ اعزاز کیوں قبول کیا؟ جواب میں بھی اقبالیات خاموش ہے اور یہ نہیں بتاتی کہ دراصل اقبالؔ یورپ سے واپسی کے بعد حیدر آباد دکن میں کسی مناسب ملازمت کے حصول کے خواہش مند تھے اور وہاں کی جن چند اہم شخصیات سے مستقبل قریب میں اپنے گہرے دوستانہ مراسم دیکھ رہے تھے اُن میں سر سید علی امام کا نام سر فہرست تھا،اقبالؔ اُس دور میں حیدر آبادی سحر میں ایسے مبتلا تھے کہ سر سید علی امام کی قیادت میں اُس علاقے کو احیائے اسلام کا مرکز بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے لیکن ''اسرارِ خودی'' کی اشاعت دوم کا وقت آنے تک جب یہ دیوانے کا خواب دکھائی دینے لگا تو اقبالؔ نے اس کتاب کو آسمانی صحائف ایسی اہمیت دینے والے اپنے مداحوں کی رائے سے اتفاق کرنا باعثِ توقیر سمجھا اور ایک دنیا دار کے نام کیا گیا انتساب حذف کر دیا۔اس ضمن میں ایک اور روایت جسے بحث کا حصہ بنانے سے اکثر گریز برتا گیا وہ یہ ہے کہ ''اسرارِ خودی'' کی اشاعت دوم کا وقت آنے سے قبل سید امداد امام اثرؔ جو اُردو کے اولین ناقدین میں ایک اہم نام ہیں اور اپنے وقت میں تاریخ، مذہبی علوم اور شعر و ادب کی دنیا میں نہایت اہم مقام رکھتے تھے اپنے بیٹے سر سید علی امام سے متنفر ہو کر قطع تعلق اختیار کر چکے تھے اور انھیں 'کرسٹان' قرار دینے لگے تھے سو اقبالؔ ایسی شخصیت کے نام کتاب معنون کرنے کے متحمل نہ رہ سکے۔

''اسرارِ خودی'' کے حوالے سے تیسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اقبالؔ نے اشاعت دوم میں اس مثنوی کا وہ دیباچہ بھی حذف کر دیا جس پر انھیں اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔سوال یہ ہے کہ دیباچے میں آخر کون سی ایسی بات تھی جس کے پیش نظر اقبالؔ کو یہ قدم اُٹھانا پڑا اور کیوں؟ جہاں تک اس سوال کے پہلے حصے کا تعلق ہے تو اس پر تو اقبال شناس کھلے دل سے روشنی ڈالتے اور یہ بتاتے ہیں کہ ''اسرارِ خودی'' کا دیباچہ دراصل اقبالؔ کی اُس تحقیق کا ہی ایک طرح سے عکس کہا جاسکتا ہے جو انھوں نے برطانیہ اور جرمنی میں قیام کے دوران ''ایران میں فلسفہ ما بعد الطبیعات کا ارتقاء' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھتے ہوئے کی اور یہی وہ دور تھا جب اسلامی تصوف، مسلم تہذیب اور عقلِ انسانی ایسے دیگر موضوعات میں اُنھوں نے دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ دیباچے میں جن خیالات کا اظہار ملتا ہے اُن سے بھی یہ بات عیاں ہے کہ اقبالؔ مشرق کے ساتھ ساتھ مغرب میں فلسفے کی روایت سے بھی پوری آگہی رکھتے ہیں اور اس موضوع پر اُن کا مطالعہ نہایت گہرا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''ہندو حکما نے مسئلہ وحدت الوجود کے اسباب میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا۔مگر ایرانی شعراء نے اس مسئلہ کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا یعنی انھوں نے دل کو اپنی آماجگاہ بنایا اور ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلہ نے عوام تک پہنچ کر تقریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔۔۔انگریزی قوم کی عملی نکتہ رسی کا احسان تمام دنیا کی قوموں پر ہے کہ اس قوم میں 'حسِ واقعات' اقوامِ عالم کی نسبت زیادہ تیز اور ترقی یافتہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ کوئی 'دماغ یافتہ' فلسفیانہ نظام جو واقعات متعارفہ کی تیز روشنی کا متحمل نہ ہو سکتا ہو انگلستان کی سرزمین میں آج تک مقبول نہیں ہوا۔پس حکماء انگلستان کی تحریریں ادبیاتِ عالم میں ایک خاص پایہ رکھتی ہیں اور اس

قابل ہیں کہ مشرقی دل و دماغ ان سے مستفید ہو کر اپنی قدیم فلسفیانہ روایات پر نظر ثانی کریں۔‘‘[۵]

اقبال کا یہ دیباچہ جن دو اہم نکات پر ایک مختصر تحریر ہے وہ اسلامی اقوام میں ذوقِ عمل کم ہونا اور مغربی اقوام میں عملی نکتہ رسی کو اہم سمجھنا ہیں۔ ’’اسرارِ خودی‘‘ کے بعد کے تخلیقی کارناموں میں بھی ان دو نکات پر اقبال کی خاص توجہ بڑی واضح دکھائی دیتی ہے یہ الگ بات کہ سلیم احمد کے خیال میں اقبال چونکہ خود بے عملی کا پیکر تھے جو موت کی دوسری شکل ہے اس لیے زور دیتے ہیں کہ انسان صرف عمل ہی کے ذریعے فنا کے دام سے آزاد ہو سکتا ہے[۶] بہر کیف یہ ایک الگ بحث ہے جس پر ’اقبال اور تصوف‘ اور ایسے دیگر ذیلی عنوانات کے تحت مختلف ناقدین دفتر سیاہ کر چکے ہیں البتہ دیکھنا یہ ہے کہ اقبال نے یہ مختصر دیباچہ کیوں حذف کیا؟ انھوں نے خود اپنے اس امر پر روشنی ڈالتے ہوئے حافظ محمد اسلم جیراج پوری کے نام خط محررہ ۱۷ مئی ۱۹۱۹ء میں لکھا ہے کہ دیباچہ بہت مختصر تھا اور اپنے اختصار کی وجہ سے غلط فہمی کا باعث تھا[۷] جبکہ اقبال کے خلاف جتنا بھی طوفان اُس دور میں مختلف لکھاریوں بشمول خواجہ حسن نظامی کی طرف سے اُٹھا تھا اُس میں اُن کے دیباچے پر بلا واسطہ طور پر ہی اعتراضات ہوئے اور اصل نقطۂ اعتراض دیباچے سے ہٹ کر تھا البتہ انھوں نے خود ہی یہ محسوس کر لیا کہ یہ تحریر اپنے اختصار کی وجہ سے مافی الضمیر کا پوری طرح اظہار کرنے سے قاصر ہے سو یہ موضوع ایک الگ تصنیف کا متقاضی ہے۔ اسی سوچ کے تحت انھوں نے ایک الگ تصنیف کا پورا منصوبہ بھی بنایا لیکن ’’اسرارِ خودی‘‘ کی اشاعت پر ہونے والے قلمی ہنگامے کی مکرر نمود کے خوف سے یہ منصوبہ ادھورا چھوڑ دیا، اس ضمن میں تفصیلی بحث آئندہ صفحات میں آئے گی فی الحال دیباچے کے بعد اُس مواد کا ذکر ہو جائے جسے اقبال نے اشاعت دوم میں حذف کر دیا۔ یہ فارسی کے معروف صوفی شاعر اور اپنے ہم عصروں کی نظر میں ولیٔ کامل کی حیثیت رکھنے والے خواجہ حافظ کے متعلق چند اشعار تھے[۸] جن میں اقبال نے اُن کی صوفیانہ فکر (جسے کچھ ناقدین اُن کا ادبی نصب العین بھی کہتے ہیں) کو انسانی زندگی میں بے عملی کا درس دینے والی تعلیمات سے تعبیر کیا حالانکہ ایک دور میں وہ خود عطیہ فیضی کو فارسی شعراء میں سے زیادہ تر حافظ کا کلام ہی پڑھ کر سنایا کرتے تھے[۹] بہر حال ’’اسرارِ خودی‘‘ کی اشاعت سے پہلے بھی اس نوع کی صوفیانہ فکر کو انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسے منعقدہ ۱۹۱۴ء میں ’عجمی تصوف اور اسلام‘ کے موضوع پر خطبہ دیتے ہوئے خلافِ اسلام قرار دے چکے تھے لیکن ’’اسرارِ خودی‘‘ کی اشاعت کا مرحلہ آنے تک اس کی مخالفت میں کوئی بیان منظرِ عام پر نہ آیا تھا حالانکہ اُسی جلسے میں اقبال نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ مذکورہ موضوع پر وہ ایک مثنوی لکھ رہے ہیں۔ سو یہ کہنا کہ بادِ مخالف کی اصل وجہ اقبال کا بنیادی موضوع (تصوف کی مخالفت اور بیداریٔ خودی) نہیں بلکہ اس کے ضمن میں حافظ کا ذکر تھا‘ ایک حد تک ہی درست ہو سکتا ہے کیونکہ اس دوسرے پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس فلسفے کے پیروکاروں کی اقبال سے تمام دوستی اور عقیدت کے باوجود انھوں نے اپنے سلسلہ معاش کی اساس پر اقبال کی ضرب کاری کسی طرح برداشت نہ کی تھی۔ بہر کیف انھیں کو اس قدر شدید ردِ عمل کا اندازہ نہ تھا جو ’’اسرارِ خودی‘‘ کی اشاعت کے چند ہی ماہ بعد شروع ہو گیا اور مخالفت کرنے والوں میں اقبال کے دوست اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کی صوفیانہ لڑی سے منسلک خواجہ حسن نظامی (۱۸۷۹ء۔۱۹۵۵ء) کے علاوہ اقبال کے دیگر ایسے احباب بھی پیش پیش تھے جو مثنوی کی اشاعت سے پہلے اس کے تصنیفی مراحل میں اُن کی حوصلہ افزائی کرتے رہے تھے۔ خیر اپنے موقف کی وضاحت میں اقبال نے بھی مختلف رسائل میں مضامین لکھے۔ اس قلمی ہنگامے کی تفصیل اقبال کے مختلف سوانح نگاروں کے ہاں بآسانی مل جاتی ہے۔ اس شورش کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال نے اشاعت دوم میں حافظ سے متعلق اشعار حذف کر کے ان کی جگہ حقیقتِ شعر اور اصلاحِ ادبیات اسلامیہ کے زیر عنوان نئے اشعار شامل کر دیے۔ مختلف اقبال شناسوں نے اس امر کی وضاحت کے طور پر کبھی اسے اقبال کے والدِ محترم کا حکم قرار دیا اور کبھی یہ بتایا کہ دراصل انھیں احساس ہو چکا تھا کہ مذکورہ اشعار سے قاری کی پوری توجہ اصل موضوع کی طرف نہیں رہتی۔ سوال یہ ہے کہ اگر ان دونوں

باتوں کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو اقبالؔ اپنی ذات میں تضادات کا شکار ہی نہیں بلکہ فیصلہ کرنے اور اُس پر برقرار رہنے کی قوت سے بھی محروم دکھائی دیتے ہیں، مثنوی لکھنے کے ایک برس بعد بھی وہ اس موقف کا برملا اظہار کرتے تھے:

> ''کسی شاعر کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے کوئی معیار ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک وہ معیار یہ ہے کہ اگر کسی شاعر کے اشعار اغراض زندگی میں ممد ہیں تو وہ شاعر اچھا ہے اور اگر اس کے اشعار زندگی کے منافی ہیں یا زندگی کی قوت کو کمزور اور پست کرنے کا میلان رکھتے ہیں تو وہ شاعر خصوصاً قومی اعتبار سے مضرت رساں ہے۔۔۔جو حالت خواجہ حافظ اپنے پڑھنے والے کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں (یعنی بہ حیثیت صوفی ہونے کے) وہ حالت افراد و اقوام کے لیے جو اس زمان و مکاں کی دنیا میں رہتے ہیں، نہایت ہی خطرناک ہے۔''[۱۰]

لیکن مزید دو برس گزر جانے کے بعد اچانک انھیں حافظؔ کی فکر سے متعلق یہ خیالات مثنوی میں نامناسب یا غیر موزوں کیونکر لگنے لگے؟ اس سوال پر ایک دفعہ پھر اقبالیات کھل کر روشنی ڈالنے سے عاری دکھائی دیتی ہے کہ اقبالؔ کا یہ قدم اگرچہ بے عملی کا نمونہ نہیں کہا جاسکتا لیکن ایک عمل پر قائم نہ رہنے کے مترادف ضرور ہے۔اُن کے مزاج کو سمجھنے کے لیے خواجہ حسن نظامی کے ساتھ قلمی معرکہ آرائی کے ایام میں اکبر الٰہ آبادی کے نام خطوط کو سامنے رکھنا خاصا معاون ثابت ہوسکتا ہے جس میں اقبالؔ علمی سطح کے دلائل کو ایک طرف رکھ کر خواجہ حسن نظامی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ معذور ہیں، صوفی ضرور ہیں مگر تصوف کی تاریخ و ادبیات و علوم القرآن سے مطلق واقفیت نہیں رکھتے[۱۱] حالانکہ پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کرتے وقت اُس میں قرآنی آیات و احادیث کے حوالہ جات اور تراجم وغیرہ شامل کرنے کے لیے اُسی خواجہ حسن نظامی سے رہنمائی لیتے رہے تھے۔ بہرصورت اقبالؔ کو اپنے علمی اور سماجی مقام و مرتبے کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا اور اِس بنی بنائی ساکھ کو وہ قلمی ہنگامے کی نذر نہیں کرنا چاہتے تھے سو نتیجہ یہی ہوا کہ مخالفین کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور وہ اشعار ترک کر دیے جن کا ذکر ہمیشہ سے ''اسرارِ خودی'' کے ساتھ ہی آتا رہا اور آج بھی اس مثنوی کا ہر سنجیدہ قاری اُن میں یکساں دلچسپی لیتا ہے۔

قیامِ یورپ کے دوران اقبالؔ کے ذہن میں پی ایچ ڈی کی تحقیق کے بطن سے ہی ایک اور خیال نے بھی جنم لیا تھا' اس کا عملی سطح پر ایک معمولی اظہار ''اسرارِ خودی'' کا دیباچہ تھا جسے اُس موضوع پر مختصر تحریر سمجھا گیا۔ جنوری اور فروری ۱۹۱۶ء میں لکھے گئے اقبالؔ کے دستیاب خطوط سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھیں دیباچے کے اختصار کا اندازہ بہت پہلے ہوگیا تھا اسی لیے موضوع کی مناسبت سے ایک ایسا طویل مضمون بھی لکھنا شروع کر چکے تھے جو تصوف کے تعارف اور اسلام میں اس کی گنجائش کے علاوہ صوفی ازم کی مستحکم روایت پر ایک شاندار تنقیدی مضمون ہوسکتا تھا۔ اکبر الٰہ آبادی کے نام خط محررہ ۴ فروری ۱۹۱۶ء میں رقمطراز ہیں کہ:

> ''میں تصوف کی تاریخ پر ایک مبسوط مضمون لکھ رہا ہوں جو ممکن ہے ایک کتاب بن جائے۔ چونکہ خواجہ حسن نظامی نے عام طور پر اخباروں میں میری نسبت یہ مشہور کر دیا ہے کہ میں صوفیائے کرام سے بدظن ہوں اس واسطے مجھے اپنی پوزیشن صاف اور واضح کرنی ضروری ہے ورنہ اس طویل مضمون کے لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔''[۱۲]

اقبالؔ نے اعتراضات کے جواب میں جتنے مقالات تحریر کیے اُن سے بھی جب اپنی پوزیشن واضح ہوتی دکھائی نہ دی تو انھوں نے مذکورہ طویل مضمون لکھنا شروع کیا جو واقعتاً ایک مستقل تصنیف کی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔[۱۳] اقبالؔ نے اس کتاب کے دو ابواب، اول بعنوان ''تصوف کی ابتداء کیونکر ہوئی'' اور دوم بعنوان ''تصوف کے ارتقاء پر ایک تاریخی تبصرہ'' مکمل بھی کر لیے تھے پھر ایسا کیا ہوا کہ انھوں نے اس کام کو وہیں ادھورا چھوڑ کر تمام توجہ ''رموزِ بے خودی'' کی تصنیف پر دینا شروع کر دی۔ اس سوال کا ایک روایتی جواب

جومختلف اقبالؔ شناسوں کے ہاں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ دراصل اقبالؔ کو اس موضوع پر مزید لکھنے کے لیے 'رسالہ کتاب الطّواسین' اور ایسی دیگر کتب پر مشتمل جو مسالہ درکار تھا اور جس کا ذکر اُن کے خطوط میں بھی ملتا ہے وہ دستیاب نہ ہو سکا، علاوہ ازیں مثنوی کے دوسرے حصے کی تکمیل زیادہ اہم تھی اس لیے انھوں نے اس موقع پر تصوف کی تاریخ لکھنے کا کام موخر کر دیا۔لیکن تصویر کا دوسرا رُخ اور نسبتاً زیادہ واضح پہلو یہ دکھائی دیتا ہے کہ اُس کتاب کا تیسرا باب حسین بن منصور حلاج کے حوالے سے جبکہ باب چہارم بعنوان ''تصوف اور اسلام'' اور باب پنجم بعنوان ''تصوف اور شاعری'' تھا ، اقبالؔ ان ابواب کے متوقع مشمولات پر نوٹس بھی لے چکے تھے لیکن خواجہ حافظؔ کے حوالے سے اُٹھنے والے طوفان نے اُنھیں چوکنا کر دیا اور لاشعوری طور پر وہ اس تصنیف کو پوزیشن واضح کرنے کے بجائے جلتی پر تیل کا کام انجام دینے اور مزید سوالات کو جنم دینے والی کتاب کی صورت میں دیکھنے لگے سو خواجہ حافظؔ کے بعد حسین بن منصور حلاج کے حوالے سے متوقع بادِ مخالف کے اگلے شدید جھونکے کی آہٹ کو محسوس کرتے ہوئے مذکورہ منصوبہ ترک کر دینے میں ہی عافیت سمجھی۔ایک مثال کے لیے حسین بن منصور حلاج کے حوالے سے نوٹ ملاحظہ کریں جس میں لکھتے ہیں :

> ''کتاب الفہرست الندیم میں لکھا ہے کہ بادشاہوں کے سامنے منصور اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کرتا تھا اور عوام کے سامنے صوفی، علومِ قرآن و فقہ وغیرہ میں دسترس نہ رکھتا تھا۔علامہ الندیم نے اسمعیلہ کی ذیل میں اس کا تذکرہ لکھا ہے (اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرمطی تحریک سے اس کا تعلق معلوم ہوتا ہے)۔''[۱۴]

علامہ الندیم کے خیالات کے حوالہ دینے کے بعد جب اقبالؔ نے قوسین میں حسین بن منصور حلاج کے قرمطی تحریک سے تعلق کا غالب گمان ظاہر کیا ہے تو ظاہر ہے کہ اس حوالے سے وہ مزید تفصیل میں بھی جاتے اور واضح کرتے کہ فرقہ قرامطہ مکّہ پر ہلہ بول کر حجرِ اسود اٹھا لے جانے والا اعراق کا ایک باطنی فرقہ تھا، پھر بقول علامہ الندیم حسین بن منصور حلاج کے بادشاہوں اور عوام الناس کے سامنے بہروپ سے بھی بحث آتی تو عین ممکن تھا یہ معاملہ بھی متنازع ہو جاتا کہ اس سے عجمی تصوف کی اُس عمارت پر سوالیہ نشان لگتا جو منصور کی روایت کا تسلسل تھی، اسی خوف سے اقبالؔ نے وہ منصوبہ ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا۔اقبالیات پر مختلف کتب میں اقبالؔ کی موعودہ تصانیف کے ضمن میں ''تاریخِ تصوف'' کے عنوان سے اس کتاب کا ذکر بھی آیا ہے، اسے باقاعدہ طور پر ڈاکٹر صابر کلوروی نے مع مقدمہ، حواشی، کتابیات اور اشاریہ مارچ ۱۹۸۵ء میں ترتیب دے کر مکتبۂ تعمیرِ انسانیت لاہور سے شائع کرایا۔

اقبالؔ کے حوالے سے سوالات کا یہ سلسلہ ''اسرارِ خودی'' سے شروع ہو کر ''تاریخِ تصوف'' پر ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کے بعد کی صورتحال مزید اُلجھاؤ اور تجسس پیدا کرتی ہے جب اقبالؔ پر ایسے سوالات حکیم الاُمت کی شان میں گستاخی کے مترادف سمجھے جاتے ہیں :

- 'شکوہ' ایسی شہرۂ آفاق نظم کہنے کے بعد کن معروضی حالات سے سمجھوتے کی صورت میں 'جوابِ شکوہ' منظر عام پر آئی؟
- اقبالؔ نے اپنے خطبات کے لیے ذریعہ اظہار کے طور پر انگریزی زبان کا انتخاب کیوں کیا جب اپنی نگرانی میں ہی بعد ازاں اس کا اُردو ترجمہ بھی کرانا تھا؟
- خطبۂ الٰہ آباد میں اقبالؔ نے جو کچھ کہا اُسے نظریۂ پاکستان کا نام دے مطالعۂ پاکستان کی کتب میں شامل کرنے والے اس بات کو نظر انداز کیوں کر دیتے ہیں کہ انھوں نے متحدہ ہندوستان کے اندر ہی ایک مسلم ریاست کی بات کی تھی اور تقسیمِ ہند کے علمبردار کبھی بھی نہ رہے تھے! (دیکھیے: مکتوب اقبالؔ بنام مولانا راغب احسن، محررہ ۶/ مارچ ۱۹۳۴ء)
- اقبالؔ نے اپنی فارسی شاعری میں جس فلسفیانہ فکر کا تانہ بانہ بنا ہے، اُردو شاعری میں وہ کیوں مفقود ہے؟
- عملی سیاست میں محمد علی جناح کے ساتھ اُن کی کیوں نہ بن پڑی؟ آیا وہ قوم پرستی کی وجہ سے میدانِ سیاست میں کامیاب نہ

ہو سکے یا اصل محرکات کچھ اور تھے؟

- حکیم الامت اپنی خانگی زندگی میں آخر کس نفسیاتی اُلجھاؤ کا شکار تھے جو ایک انجان پتہ سے موصول ہونے والے خط پر ایسے کنفیوز ہوئے کہ اُن کی دوسری شادی دراصل تیسری شادی بن گئی !
- فکرِ اسلامی کو اپنی شاعری اور خطبات میں موضوعِ بحث بنا کر فلسفیانہ نظریات رقم کرنے والے اقبالؔ عملی زندگی میں بالخصوص وراثت کے حوالے سے مذہبِ اسلام کے اُصولوں پر کس قدر عمل پیرا ہیں!!
- استعماری طاقت سے ''سر'' کا خطاب آخر کس مصلحت کے تحت قبول کیا ؟
- پاکستان کی ہیئتِ مقتدرہ کے لیے بطور ہیرو جس طور پر اقبالؔ قابلِ قبول رہے ہیں محمد علی جناح بانیٔ پاکستان کہلائے جانے کے باوجود کیوں نہ رہے؟

ایسے تمام سوالات کا جواب ایسا نہیں ہے کہ روایتی اقبالؔ شناسوں کے پاس موجود نہیں ، یقیناً ہے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ اقبالؔ پر تحقیق وتنقید کا بڑا حصہ ان جوابات کی تلاش وتوضیح کا طلب گار نہیں رہا یا ہونے نہ دیا گیا۔اقبالؔ نے کسی موقع پر کہا تھا کہ ایک قوال کو حال نہیں آنا چاہیے سو اُنھوں نے خود تو تمام عمر اس کیفیت میں جانے سے ڈرتے ہوئے گزار نا ہی تھی ساتھ ہی ساتھ اپنے مداحوں کو بھی اس سے ایسا خوفزدہ کر گئے کہ وہ اقبالؔ کو اُن کے لگے بندھے فکری مقام ومرتبے سے ہٹ کر ایک عام انسان کے رُوپ میں دیکھنا گوارا کرتے ہیں نہ ہی اُن کی اس حیثیت کے تناظر میں سوالات سننا پسند کرتے ہیں۔اقبالؔ ایک بڑے شاعر تھے اور بلا شبہ اس بیان پر کوئی دوسری رائے موجود نہیں لیکن اُن کے عمل میں خیر وشر کی تقسیم کے نظریات اور فطرت کے نوری و ناری حصے کی کشمکش نے جو ثنویت پیدا کی اُسے بھی اقبالیاتی تحقیق وتنقید میں سامنے رکھنا ضروری ہے۔خواہ اقبالؔ کی ذات میں موجود ثنویت ایک پیکار کی صورت ہے لیکن یہ اُن کی تخلیقی کائنات کے ارتقاء کا حصہ ہے،سر محمد اقبال اور حکیم الامت کے درمیان فاصلاتی سے کہیں زیادہ فیصلاتی پہلو غور طلب ہے جس میں نہ صرف اقبالؔ خود اُلجھے رہے بلکہ اپنے ناقدین کے اُلجھاؤ کے لیے بھی ایسی سازگار فضا پیدا کر گئے جس میں دمادم صدائے کن فیکون کے علاوہ کچھ اور سنائی نہیں دیتا۔تنقید، جو جانچ اور پرکھ کا نام ہے جو کھرا اور کھوٹا الگ الگ کرتی ہے اور جونئی سے نئی تعبیرات کی طرف جانے کی دعوت دیتی ہے،کم از کم وہ تو ایسی فضا کی متحمل ہو کر اقبالؔ کے مطالعے کی دعوت نہیں دی سکتی۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ ''زندہ رُود''،ص۲۰۲

۲۔ ''کلیاتِ مکاتیبِ اقبال(جلد اول)''مرتبہ: سید مظفر حسن برنی،۱۹۹۳ء،اشاعت چہارم، دہلی، اُردو اکادمی،ص۳۳۳

۳۔ پٹنہ سے تعلق رکھنے والے ایک بیرسٹر تھے جو بعد میں ریاست حیدر آباد دکن کے وزیرِ اعظم رہے۔سید علی امام عربی ، فارسی اور اُردو زبان پر یکساں دسترس رکھتے تھے اور اقبالؔ کی پسندیدہ شخصیات میں سے ایک تھے۔

۴۔ ''زندہ رُود''،ص ۲۰۶

۵۔ ''تلاشِ اقبال''،ص ۱۸۸،۱۸۹

۶۔ تفصیل کے لیے دیکھیے''اقبال: ایک شاعر''از سلیم احمد،ص ۲۵۔۳۵

۷۔ ''کلیاتِ مکاتیبِ اقبال(جلد دوم)''مرتبہ: سید مظفر حسن برنی،۱۹۹۳ء،اشاعت دوم، دہلی، اُردو اکادمی،ص۹۳

۸۔ متروک اشعار بابت خواجہ حافظ در ''اسرارِ خودی''

ہوشیار از حافظ صہبا گسار	جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
رہن ساقی خرقۂ پرہیز او	مے علاج ہولِ رستا خیزِ او
نیست غیر از بادہ در بازارِ او	از دو جام آشفتہ شد دستارِ او
چوں جرس صد نالۂ رسوا کشید	عیش ہم در منزلِ جاناں ندید
آں فقیہ ملت مے خوار گاں	آں امام امتِ بیچارگاں
گو اسفند است و نوا آموخت است	عشوہ و ناز و ادا آموخت است
دلربائی ہائے از زہر است و بس	چشمِ او غارت گرِ شہر است و بس
از بزِ یوناں زمیں زیرک تراست	پردۂ عودش حجابِ اکبر است
بگزر از جامش کہ در مینائے خویش	چوں مریدان حسن دارد حشیش
محفل او در خورِ ابرار نیست	ساغر و قابلِ احرار نیست

بے نیاز از محفل حافظ گزر
الحذر از گوسفنداں الحذر

۹۔ ''زندہ رُود''، ص ۱۱۹

۱۰۔ ''مقالاتِ اقبال'' مرتبہ سید عبدالواحد معینی، عبداللہ قریشی، ص ۲۰۶، ۲۰۷

۱۱۔ ''کلیاتِ مکاتیبِ اقبال (جلد اول)''، ص ۴۶۲ ۱۲۔ ایضاً ص ۴۶۶

۱۳۔ اقبالؔ کی اس (نامکمل) تصنیف کا دو حصوں پر مشتمل خاکہ ڈاکٹر صابر کلوری کی مرتبہ ''تاریخ تصوف'' از اقبالؔ (ص ۲۷) میں درج ہے، پہلا حصہ ابتدائی خاکہ جبکہ دوسرا حصہ اُسی کی ترقی یافتہ شکل ہے، ملاحظہ کریں:

حصہ اول

۱۔ تصوف پر تاریخی تبصرہ ۲۔ تصوف پر ایک نگاہ علم النفس اور علم الحیات کے اعتبار سے

۳۔ تصوف اور اسلام ۴۔ تصوف اور ادبیاتِ اسلامیہ

۵۔ رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی تصوف کے متعلق (یظہر فیھو السمن......قاضی عیاض)

۶۔ آیہ قرآنی اور وحدت الوجود

حصہ دوم

۱۔ مسئلہ وحدت الوجود اور آیات قرآنی و احادیثِ نبوی

۲۔ رسول اللہ صلعم کی پیش گوئی تصوف کے متعلق (السمن، قاضی عیاض) مجمع البحرین دارا شکوہ

۳۔ تصوف اور ادبیاتِ اسلامیہ ۴۔ تصوف پر ایک نگاہ علم النفس اور علم الحیات کے اعتبار سے ۵۔ منصور حلاج

۶۔ افلاطونیت جدید اور یونانی صوفیا ۷۔ تصوف پر ایک عام تاریخی تبصرہ ۸۔ مسلمانوں میں صوفی نصب العین پیدا ہونے کے اسباب

۹۔ تصوف اور شعار اسلامیہ ۱۰۔ اسلام اور دنیا ۱۴۔ ''تاریخ تصوف'' از اقبال (مرتبہ: ڈاکٹر صابر کلوروی)، ص ۲۵